اردو ناول میں مزاحمتی تذبذب

محمد نعیم☆

Abstract

This article tries to explore the ambivalent behavior of Urdu novel towards colonialism. It argues that Urdu novel writers of nineteenth century, instead resisting directly to colonialism, chose indirect strategies of representation. Novels try to create a discursive structure of religious dichotomy of colonizer and colonized, and try at their capacity to create a negative picture of the colonizer.

ادب زندگی کا متبادل نہیں ہوتا، البتہ اس کا عکاس یا اس کے متبادل زندگی کے نقشے ضرور بناتا ہے۔ اگر اس کے تاریخی ارتقا یا مختلف تاریخی ادوار میں اس کے کردار پر نظر دوڑائی جائے، تو یہ بیش تر موجود سے زیادہ ناموجود کا دلدادہ اور اس کا رُخ مطمئن سے زیادہ بے چینی کی طرف رہا ہے۔ ادب کی بنیاد متخیلہ پر ہوتی ہے، اسی لیے مزاجاً سکون کی بجائے تحرک اور جمود کی بجائے تبدیلی اسے راس آتی ہے۔ اسی بے چین مزاج کا رنگ بعض اوقات تیکھا ہو کر بغاوت کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ سچائی کو گرفت میں لینے کے علاوہ، سچائی خلق کرنے کی صلاحیت اس کی ہمہ گیریت کو اور زیادہ بڑھا دیتی ہے۔ اہل فلسفہ اور مقتدرہ کی ہمیشہ سے کوشش رہی ہے کہ متخیلہ پر معقلہ کا پہرہ بٹھا کر اسے قید کیا جائے، لیکن نابغہ ذہن اور ادب کی سیمابی فطرت، ایسے کسی مقصد کو کامیابی سے ہم کنار ہونے کا موقع کم ہی فراہم کرتی ہے۔

جہاں تک مزاحمتی رویوں کا سوال ہے تو اردو ناول کے تناظر میں نمایاں ترین نام عبدالحلیم شرر

☆ لیکچرار شعبہ اردو، سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا

کا ہے۔ ان کے تاریخی ناولوں میں ماضی سے ایسی مثالیں تلاش کر کے لانا، جن سے موجودہ ہار کی تلافی ہو سکے، عیسائی مشنریوں اور ننوں کی ہندوستان میں تیزی سے ترقی کرتی سرگرمیوں کے جواب میں ان کے ''شرمناک'' افعال سے لوگوں میں ان کے خلاف رائے ہموار کرنا، عیسائیت کے مذہبی سوالات کا مسکت جواب دینا اور ماضی کی پُرشکوہ مثالوں کی مدد سے ہاری ہوئی مقامی آبادی کا اعتماد بحال کرنے کی کوشش کرنا جیسی مثالیں موجود ہیں۔

شرر کی تاریخی ناول نگاری کے محرکات کے ضمن میں ناقدین میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض ان کے تاریخی ناولوں کو سر والٹر سکاٹ کے ناول طلسمان (Talisman) سے متاثر بتاتے ہیں۔ ایسے ناقدین دلیل کے لیے شرر کے بعض بیانات کو سامنے لاتے ہیں۔(۱) ایسی کسی بھی رائے کو قائم کرنے سے پیش تر انیسویں صدی کی تاریخی اور سماجی صورتحال کو دیکھ لینا مفید ہوسکتا ہے۔ اگر شرر کو ان کے عہد میں رکھ کر دیکھیں تو متعدد باتیں کھل کر سامنے آتی ہیں۔ ۱۸۵۶ء میں لکھنو کا استعماری حکومت میں انضمام ایک ایسا واقعہ ہے جس کے لکھنو کے باسیوں پر گہرے نفسیاتی اثرات ہیں۔ آصف الدولہ کے بعد اودھ کی سلطنت میں واجد علی شاہ کو اپنی عوام دوستی کے سبب لوگوں کے دلوں میں محبت اور تکریم حاصل تھی۔ اس لیے جب انھیں معزول کر کے مٹیا برج بھیج دیا گیا تو لکھنو کی گلیوں میں کہرام مچ گیا۔ لوگ اپنی طاقت سے ناواقف تھے اس لیے سوگ کی کیفیت اور نوحوں میں اس کا اظہار تو بہت ہوا البتہ اس قبضے کے خلاف عملاً کوئی کوشش نہیں ہوئی۔(۲)

کلکتہ کے نزدیک مٹیا برج کے علاقے میں واجد علی شاہ اور ان کے قریبی ساتھیوں نے مل کر ایک سلطنت کی بنیاد رکھنے کی اپنی سی کوشش کی۔ ان کی معیت میں شرر کا گھرانہ بھی مٹیا برج کو ہجرت کر گیا تھا، جہاں ان کی پرورش ہوئی۔ ظاہر ہے ان ابتدائی برسوں میں، وہاں انگریزوں کے حوالے سے کوئی اچھی رائے تو قائم نہ ہوئی ہوگی۔

ہندوستان میں عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں کو بھی شرر کے ناولوں کی تفہیم کے لیے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان میں اٹھارویں اور انیسویں صدی کے دوران مشنریوں کا سلسلہ کافی سرگرم

رہا۔ ان کی اشاعتی اور تبلیغی سرگرمیوں نے مناظرے کا بازار گرم کرنے اور ہندوستانیوں میں اپنے مذہب کو ان بنیادوں پر پیش کرنے کی راہ دکھائی جو عیسائیوں کے لیے قابلِ قبول ہوں۔ ان مشنریوں کی کامیابی یہ تھی کہ دہلی کالج کے اساتذہ تک عیسائیت قبول کر لیتے ہیں۔ قحط کے زمانوں میں خصوصاً ان مشنوں کی سرگرمیاں اپنے عروج پر ہوتی تھیں، جب یہ مساکین کے بچوں کو نوالے کے عوض بپتسمہ دینے کے درپے رہتے تھے۔(۳)

ان مشنریوں کی ہندوستان آمد اور یہاں ان کی سرگرمیوں میں انیسویں صدی کے دوران تیزی سے اضافہ ہوا۔ مثلاً انیسویں صدی کے ابتدائی عشروں میں مشنریوں کی تعداد جو بیس سے کم تھی، چھٹی دہائی تک آتے آتے چار سو سے زائد ہوگئی۔ ان مشنریوں نے یہاں سکول کھولے، چرچ قائم کیے، لیکچروں کے سلسلے شروع کیے اور سکول بک سوسائٹیوں کے ذریعے عیسائیت کی تبلیغ کا تسلسل قائم کیا۔ ۱۸۵۹ء میں مشنری سکولوں میں تعلیم پانے والے ہندوستانی طلبا کی تعداد پچھتر ہزار سے زائد تھی۔ ریورنڈ ایڈورڈ سٹورو (Rev. Edward Storrow) ان طالب علموں کی بڑھتی ہوئی تعداد پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ان سکولوں میں عیسائیت کی تعلیم دی جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب کوئی تعلیم یافتہ ہندوستانی، عیسائیت کی مبادیات سے بے بہرہ نہیں رہا۔(۴)

ان سکولوں کے علاوہ گاؤں اور قصبے کی سطح پر کام کر رہی عیسائی مشن کی انجمنوں کا کردار بھی شرر کے ذہنی رویوں کو سمجھنے میں معاون ہے۔ عیسائیت اور مشنریوں کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کے آگے بند باندھنے کی کوشش، شرر کے وہ ناول ہیں جن میں مشنریوں اور ننوں کی ''سیاہ کاریوں'' کی تصویر بہت ہی واضح اور مفصل انداز میں پیش کی گئی ہے۔

اس ذیل میں ان کا ناول ''فلورا اور فلورنڈا'' خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ناول ننوں اور پادریوں کی ایسی قبیح تصویر پیش کرتا ہے، جسے دیکھ کر چرچ ایک قحبہ خانہ نظر آنے لگتا ہے۔ چرچ اس ناول میں ایک ایسے مقام کے طور پر اُبھرتا ہے جو پادریوں کے کُھل کھیلنے کا میدان ہے جہاں ان کے ناجائز بچے زندہ دفن کر دیے جاتے ہیں اور کوئی ننّ ان کی دست درازی سے نہیں بچ پاتی۔

''فلورا اور فلورنڈا'' ناول عیسائی پادریوں کی اس رومیاہی کو پیش کرتے ہوئے اتنا ہی جانبدار

اور غیر متوازن نظر آتا ہے، جتنا کوئی مرعوبی ناول انگریزوں کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے ہو جاتا ہے۔ اس ناہموار رائے اور پادریوں کی بدکاریوں کی داستان کے علاوہ یہ ناول مسلم اور عیسائی اخلاقیات کا تقابل بھی پیش کرتا ہے۔

ناول اندلسی سلطنت کے عہدِ عروج کے مناظر پیش کرتا ہے، جب عبدالرحمٰن کی زیرِ سرپرستی ہر مذہب کے پیروکاروں کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ عیسائی اس آزادی کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے اسے مسلمانوں کا ضعف خیال کرتے ہیں اور ان کی حکومت کے خلاف بغاوت کے لیے حضور اکرمؐ کی شان میں سرِ عام گستاخی کا منصوبہ بناتے ہیں۔ اس منصوبے کا روحِ رواں یولاجیس پادری ہے، جو عیسائیت کے اہم ترین مذہبی رہنماؤں میں شامل ہے۔ اس کی مساعی سے چند عیسائی جنونی ہو کر سرِ راہ، بازار اور گلیوں میں حضورؐ کی شان میں گستاخی کرنا شروع کر دیتے ہیں، جس کا مقصد سلطنت کا امن تباہ کرنا ہے۔

عیسائی مظاہر کی پیش کش کے دوران شرر کا قلم ان کے منفی رُخوں کو نمایاں کرنے میں سرگرم رہتا ہے۔ مثلاً اعتراف کی رسم ان کے ناولوں میں بے حیائی کی علامت بن کر آتی ہے جس کے دوران پادری، نوجوان خواتین سے کرید کرید کر برہنگی اور فحاشی کی باتیں پوچھتے ہیں اور اسی دوران انھیں ورغلانے کا سامان بھی کرتے ہیں۔

جہاں تک کلیسا میں ہونے والے گناہوں کا سوال ہے تو شرر پادریوں کے منہ سے اس کا جواز سامنے لے کر آتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جب فلورا پہلے فلورنڈا اور بعد میں یولاجیس کے سامنے پادریوں کی گھٹیا حرکتوں پر ملامت کر چکی ہے، جس پر یولاجیس یوں گویا ہوتا ہے۔

> ''تم کو معلوم نہیں کہ پادریوں اور راہبوں کے گناہ خدا نے معاف کر دیئے ہیں۔ ان کو دنیا کے مکروہات چھوڑتے ہی نجاتِ ابدی حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ جو گناہ کریں معاف ہے۔ ان باتوں کو گناہ کہنا بھی بے ادبی اور گستاخی ہے۔''(۵)

ناول کا میلوڈرامائی انداز اور کرداروں کا یک رخا پن اسے ان گھڑ بنا دیتا ہے۔ واضح طور پر

ایک خاص مقصد سے لکھا گیا ہے کہ عیسائی پادریوں اور ننوں کی ایسی بد اخلاق اور بے حیا تصویر دکھائی جائے کہ جو پڑھے اسے ان سے نفرت ہو جائے۔ اس نفرت کی خواہش نے شرر کو بہت سے مقامات پر جذباتی کر دیا ہے اور وہ اسے پیدا کرنے کے لیے پورے ناول میں بیانیے کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے رہے ہیں۔ البتہ ناول اس استعماری تکلمے کو چیلنج کرتا ہے جس کے مطابق مسلمان، ظالم، بے رحم، طاقت کے نشے میں چور اور بے انصاف ہیں جب کہ ان کے مقابلے میں عیسائی رحم دل، انصاف پرور اور تہذیب کی اعلیٰ سطح پر فائز ہیں۔

شرر کا ناول ''ایامِ عرب'' اگر چہ ماقبل اسلام عرب زندگی کی نقش گری کرنے کی کوشش کرتا ہے، تاہم اس میں شرر نے بت پرستوں اور عیسائیوں کے درمیان ایک مکالمہ درج کیا ہے۔ لطف یہ کہ شرر نے بت پرستوں کے دلائل کی مدد سے عیسائی عقاید کا ابطال کرنے کی کوشش کی ہے۔ طرفہ یہ کہ بت پرست عربوں میں عورتوں کی قدر و منزلت، توحید پرست عیسائی عورتوں سے زیادہ دکھائی ہے۔(۶)

مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ اور شان و شوکتِ گزشتہ کی داستان شرر کے ناول ''ملک العزیز ورجنا'' میں بیان ہوئی ہے، جس کے واقعات سلطان صلاح الدین ایوبی کی صلیبی جنگوں میں کارنامے سے متعلق ہیں۔ شرر عیسائیوں اور مسلمانوں کی جنگوں کے بیان اور ان میں مسلمانوں کی فتح کے واقعات کے ذکر سے ایک حد تک اس نفسیاتی احساسِ کمتری سے ہندوستانی مسلمانوں کو نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں، جس کا شکار اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ہونے والی پے در پے شکستوں اور خصوصاً جنگِ آزادی (۱۸۵۷ء) کی ہار کے بعد ہندوستانی مسلمان ہو گئے تھے۔ شرر کے بیان کی خصوصیت اور نئے ادبی اور علمی شعور کا اظہار، ان کی ایسی کوششوں سے ہوتا ہے، جن میں وہ عیسائیوں اور مسلمانوں کے بیان میں دونوں فریقوں کی مختلف علامتوں پر خصوصی توجہ دیتے ہیں۔ مثلاً صلیب، جھنڈا، ہلال اور خصوصاً وردیاں وغیرہ۔ دونوں گروہوں کو بیانیے میں منفرد رنگ دینے کی کوشش کے دوران، شرر بار بار ان علامتوں کو مخصوص قومی شناخت کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ عیسائیوں کی شکست کے دوران وہ خصوصاً سپہ سالار رڈی فرس ارل آف ڈربی دوم کے ہاتھ سے گرنے والی ہولی کراس کا ذکر کرتے ہیں،

جس کی طرف عیسائی فوج شکست کی بدحواسی کے دوران کوئی توجہ نہ کر پائی۔مسلمانوں کے شکوہ کے اظہار کے لیے انھوں نے ان کے نشانوں کو زیادہ بلند اور تکبیر کی آوازوں کو زیادہ کونج دار دکھایا ہے۔ اس کے علاوہ، جب ایک عیسائی فوجی نے عکہ میں داخل ہوکر، بلند عمارت پر موجود مصری جھنڈا اُتار کے، صلیبی نشان والا جھنڈا لگانے کی کوشش کی تو، ایک مسلمان کے تیر کے وار سے، اس خاص عیسائی فوجی کے قتل کو بھی شرر بیانیے میں بطورِ خاص جگہ دیتے ہیں۔(۷)

یہ ناول مسلمانوں کی حربی مہمات اور جنگی کارناموں کو بیان کرنے کے علاوہ عیسائیت اور اسلام کا تقابل پیش کر کے اسلام کے حق میں فیصلہ دینے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے مکالموں کے ذریعے اسلام کی وہ تصویر، جو عیسائی پیش کرتے ہیں، اسے چیلنج کرنے اور غلط ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس ناول اور شرر کے دوسرے ناول ''فلورا اور فلورنڈا'' میں ہیروئن عیسائیت سے برگشتہ اور اسلام کی قائل ہو جاتی ہے۔فلورا جس کی عیسائی ماں نے اس کے دل میں عیسائیت کا بیج بویا تھا، پادریوں اور ننوں کی تاریک دنیا کا تکلیف دہ تجربہ کرنے کے بعد اور ورجنا مسلمانوں کی شجاعت، نیک دلی اور اعلیٰ اخلاقی قدار سے متاثر ہوکر عیسائیت سے منہ موڑ کر اسلام سے ناتا قائم کر لیتی ہے۔

اس ناول کی خاص بات یہ ہے کہ شرر نے اس میں ہر موقع پر مسلمانوں کو فتح یاب نہیں دکھایا، بلکہ عکہ اور یافہ جیسے مقامات پر عیسائیوں کی فتح بھی بیان کر دی ہے۔ یہ الگ بات کہ جنگ کے جن مناظر کو انھوں نے بہ تفصیل بیان کیا ہے ان میں زیادہ تر مسلمانوں کا پلڑا بھاری رہا ہے اور جن مقامات پر وہ دب گئے ہیں، ان کو شرر نے کسی کردار کی زبانی دو چار جملوں میں بھگتا دیا ہے۔اس کے علاوہ عیسائیوں کی بزدلی اور کمزور عقیدگی کے ساتھ ساتھ بعض مقامات پر ان کے استقلال اور جرأت کو بھی بیانیے میں شامل کیا ہے۔اس لیے ناول کو محض اسلامی تکلمے یا طرف دار بیانیے کے طور پر پڑھنا اسے ضرورت سے زیادہ سادہ کر کے دیکھنا ہے۔(۸)

شرر کے ان تاریخی ناولوں کو پڑھ کر عیسائیوں کی ایسی تصویر سامنے آتی ہے جو اردو کے دیگر ناولوں میں نہیں ملتی۔لیکن یہ ناول اس حوالے سے ناپختہ ہیں کہ ان میں کسی تاریخی دور یا کسی خاص خطے کی

منفرد تصویر اُبھر کر سامنے نہیں آتی۔ البتہ استعماری تکلمے اور نقطہ نظر کے مخالف نقطہ نظر ان میں ضرور اُبھرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ناول اس رویے کو بھی سامنے لاتے ہیں، جس کے مطابق حال کی بے عملی کو ماضی کی عظمت کی توانائی سے باعمل بنایا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شرر کے ناول اسلامی عظمت تو دکھاتے ہیں، لیکن ان کے ناولوں میں نہ سپین اُبھرتا ہے اور عرب اور مصر بیانیے کا حصہ ہونے کے باوجود اپنی جھلک نہیں دکھاتے۔ اس لیے رام بابو سکسینہ نے کہا ہے کہ شرر کے ناولوں میں Local Colour [مقامی رنگ] نہیں ہوتا۔(۹) ناولوں پر فیض صاحب کی رائے یہ ہے کہ شرر کے ناولوں کو ''تاریخی ناول کہنا زیادہ صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ ان سے نہ ہمیں کسی تاریخی دور کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے نہ کسی تاریخی شخصیت کا تصور ذہن میں بیٹھتا ہے۔'' وہ شرر کے ناولوں کو رومانی قصے قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان رومانی قصوں سے اوّل تو روزمرہ زندگی کی تلخی بھول جانے میں مدد ملتی تھی دوسرے گزشتہ فتوحات کے تذکرہ سے کچھ خودداری کا جذبہ پیدا ہوتا، کچھ جذباتی تسکین ہوتی کہ ہم نہ سہی ہمارے آباؤ اجداد تو بہادر تھے۔ الغرض شرر کے ناولوں کو ان بنیادوں پر فیض نے ''ذہنی انتقام'' قرار دیا ہے۔(۱۰)

شرر کے یہ ناول ذہنی انتقام ہوں یا نہ ہوں اپنے معاصر ناولوں سے ایک منفرد رائے اور ذائقہ ضرور رکھتے ہیں۔ جن میں جذباتی ہونے کے باوجود استعمار کاروں کی ''خرابیاں'' بیان کرنے کی اپنی سی کوشش موجود ہے۔ شرر کا مسئلہ یہ ہے کہ انہوں نے ان تاریخی، سیاسی اور سماجی حالات کا تجزیہ تو کجا، ان پر غور کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی، جن کی وجہ سے انگریز ہندوستان پر قابض ہوئے اور ہندوستانی اقتدار کے مناظر سے آہستہ آہستہ ہٹتے چلے گئے۔ وہ اس دور کے مذہبی مفکروں کی طرح تمام مسائل کا حل مذہبی شناخت کو اجاگر کرنا سمجھتے ہیں۔ عیسائیوں کے حوالے سے مسلمانوں کی پرانی چپقلش کو اُجاگر کر کے وہ ایک طرح سے مزاحمت کا رویہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کوشش میں ان کے خلوص کی تو داد دینی چاہیے لیکن مسئلے کو جس قدر سادہ بنا کر انھوں نے دیکھا ہے۔ یقیناً ویسا نہیں تھا۔ محض مسلمان اور عیسائی کی ثنویت قائم کر کے اور ان کے قدیم جنگی تصادموں کی تصویر کشی کر لینے سے نہ تو موجودہ صورتحال سمجھ آ سکتی تھی اور نہ ان حالات کو بدلا جا سکتا تھا۔

ان کے ناولوں میں موجود جنگ و جدل اپنے زمانی اور مکانی بُعد سے ایک اور معاملے کی طرف توجہ مبذول کراوتا ہے۔عظمت کا نشان ماضی بعید میں تلاش کرنے سے یا عظمت کو عہدِ گزشتہ میں ڈھونڈنے سے جہاں ولولہ پیدا ہوتا ہے وہیں یہ زمانی بُعد حوصلہ شکن بھی ہے۔ بہادری کے یہ واقعات اتنی مدت پہلے رونما ہوئے ہیں کہ اب ان کے دوبارہ وقوع پذیر ہونے کا امکان کم ہی نظر آتا ہے۔ دوسری طرف مکانی بُعد یعنی شجاعت کے کارنامے عربوں، ایرانیوں اور ترکوں میں دکھانے سے مزاحمت کا امکان اور کم ہوگیا ہے کہ غیرت منداور شجاعت کے حامل تو غیر ہندوستانی یعنی ترک وعرب اور ایرانی وافغانی تھے، ہندوستانیوں میں یہ صلاحیتیں ناپید ہیں۔

اگر ان دو خطاط کو ذہن میں رکھا جائے تو شرر کے ناول ''قومی حمیت کی رگ کو پھڑکانے'' جیسے مقاصد کم ہی پورا کرتے نظر آتے ہیں۔ بلکہ وہ ہندوستانیوں میں اور زیادہ بے بسی، کمتری اور تہذیبی و قومی سطح پر پچھڑے ہوئے ہونے کا احساس گہرا کردیتے ہیں کہ ہندوستانیوں کی تاریخ سے کوئی واقعہ بھی انھیں بہادری یا شجاعت کے بیان کے لیے نہیں ملتا۔

جہاں تک دیگر ناول نگاروں کا سوال ہے، انیسویں صدی کی تاریخی صورتحال میں وہ تذبذب کا شکار نظر آتے ہیں۔انگریزی خوبیاں بیان کرنے کے دوران بیانیے میں ایک کش مکش، ایک مخمصے کی کیفیت نظر آتی ہے۔ جہاں یہ ناول انگریزی حکومت کی برکتیں بیان کر رہے ہوتے ہیں اور استعماری تکلمے سے کم ہی باہر نکلتے ہیں، وہاں بھی مقامی نقطہ نظر اپنی جھلک دکھاتا ہے۔یہ الگ بات کے ایسے نقطہ نظر کا اظہار کرنے والے بیشتر معتوب کردار یا ناول کے منفی کرداروں کے روپ میں پیش ہوئے ہیں۔مثلاً منشی احمد حسین خاں کے ناول ''جواں مردی'' کا بیانیہ ایسے ہی تذبذب کا شکار ہے، جو انگریزوں کی خوشامد کرتے ہوئے جنگِ آزادی کا الزام ہندوؤں خصوصاً ناناصاحب کے سر دھرنے کی کوشش کرتا ہے۔ احمد حسین خاں صاحب کی تمام تر کوششوں کے باوجود ناول کی فطری سیمابیت اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ وہ شاید نہیں جانتے تھے کہ بیانیہ ایک سطح نہیں رکھتا۔ ادب تو وہ مظہر ہے جو سب کچھ آئینہ کردیتا ہے۔تصنیف کبھی کبھی مصنف کو اپنا غلام بھی بنالیتی ہے اور خود کو لکھوالیتی ہے اپنے اصولوں اور ضابطوں پر تخلیق کا گھوڑا مصنف کی مقصدی رانوں کے درمیان ہوتے ہوئے بھی خودسر ہوجاتا ہے۔

احمد حسین صاحب کا یہ ناول ''مفسدوں'' کے عیب (نانا صاحب میں چالاکی، بے ایمانی، رشوت ستانی، عیاری، جھوٹ، فریب ہر عیب موجود ہے۔) دکھانے کے ساتھ ساتھ ان کے نقطہ نظر کو بھی سامنے لے کر آتا ہے۔ اس ذیل میں نانا صاحب اور اس کے حواریوں کے مکالمے اہمیت کے حامل ہیں، جو سرکاری نقطہ نظر کے بالمقابل جنگِ آزادی کے باغیوں کا نقطہ نظر سامنے لے کر آتے ہیں۔

''یہ تو سوداگر بن کر آئے تھے، اچھی سوداگری کی کہ ہندوستان ہی دبا بیٹھے۔'' نانا صاحب فرنگیوں سے انتہا درجے کی نفرت کرتا ہے اور ''ان متعصب کتوں کی بوٹیاں بھون بھون کر'' کھانے کا اظہار بھی کرتا۔ اس کی باغیانہ کوششوں کا مرکز ہندوستان میں انگریزوں کے قدم اکھاڑنا ہے۔ اس کے لیے چاہے اس کی جان چلی جائے: ''نانا صاحب: بخدا مجھے ذاتی طمع نہیں ہے میں چاہتا ہوں کہ چاہے میری جان جائے مگر ان فرنگیوں کے پاؤں اکھڑ جائیں۔'' آگے چل کر احمد حسین خان دکھاتے ہیں کہ کس طرح نانا صاحب کی عیاریوں سے ''بے علم اور جاہل سپاہیوں'' میں سور اور گائے کی چربی کے کارتوس کی خبر نے آگ لگا دی۔ اس پر انگریزی جنرلوں نے مصلحت کی بجائے رعونت آمیز رویے کا مظاہرہ کرتے ہوئے ''نہایت ہی غلط چال'' چلی اور اس معاملے کو سختی سے دبانا چاہا۔

جنگ کے دنوں میں بھی سپاہیوں کی زبانی ''باغیوں'' کا نقطہ نظر پیش کیا گیا ہے: ''کالی چرن: تم لوگ غاصب [ہو] ہر موقع پر ہم دیسی بھائیوں کو خون پانی کی طرح بہا ہے اور اس کا فائدہ تم نے اُٹھایا ہے نفاق کا بیج بو دیتے ہو اور اپنا کام نکال لیتے ہو۔'' ان آرا کی ناول میں شمولت کے بغیر ظاہر ہے اس کی تکمیل نامکمل تھی۔ یہ الگ بات کہ ان دونوں نقطہ ہائے نظر (سرکاری اور باغی) کے بارے احمد حسین خان صاحب کا رویہ جانبدارانہ ہے۔ وہ بغاوت کرنے والے کیا سپاہی کیا عام لوگ انھیں جاہل اور ظالم دکھاتے ہیں۔ ''میموں'' اور ان کے ''معصوم بچوں'' کو باغی جس بے رحمی سے قتل کرتے ہیں اس پر ان کی انسانیت انھیں ناول نگار کے تحمل سے گرا دیتی ہے اور وہ جذباتی ہو کر باغیوں کے خوب لتے لینے کے لیے اپنے جواں مرد ''عسکری'' کی مدد سے ان کو ان کے انجام تک پہنچا آتے ہیں۔(۱۱)

تخالف آمیزی (Ambivalence) کی یہ صورت حال ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں بھی

جھلک دکھاتی ہے۔ ان کے ناول اس لحاظ سے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں کہ اپنے دور کے بنیادی سوالوں کو اُٹھاتے ہیں۔ ان سوالوں کی تفہیم اور پیچیدگی کو گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے نقطۂ نظر سے تو اعتراض کی گنجائش موجود ہے، تاہم ان کے فن سے انصاف کے لیے ان کا اعتراف ضروری ہے۔ ''ابن الوقت'' جس کے بارے ناقدین کا دھیان سرسیّد کے بیٹے سیّد محمود نے دلایا کہ اس میں اس کے والد کا خاکہ اُڑایا گیا ہے، جسے ناقدین نے اتنا پھیلایا کہ ناول کو اپنی معاشرت نہ چھوڑنے کی تبلیغ بنا کر رکھ دیا، بیانیاتی کش مکش اور تذبذب کی بڑی واضح مثال ہے۔ یہ ناول جہاں نوبل کی زبانی انگریزوں کا نقطۂ نظر بڑی شرح وبسط کے ساتھ سامنے لاتا ہے، وہیں ابن الوقت کی تقریر جنگ آزادی کے اسباب پر نظر ڈالنے کا سبب بن جاتی ہے، جس میں ابن الوقت انگریزوں کی غلط پالیسیوں کو نشان زد کرتا ہے۔

ابن الوقت کی یہ تقریر گورنمنٹ کی خیر خواہی میں کی گئی ہے۔ جس میں غدر کے اسباب پر ایک سیر حاصل بحث موجود ہے۔ وہ جہاں غدر کے اسباب کا ذکر کرتا ہے وہیں مقامی نقطۂ نظر اور انگریزی حکومت کی خامیاں سامنے آتی ہیں۔ ان خامیوں میں انگریزوں کا عوام سے تحقیر آمیز رویہ سرِفہرست ہے۔ اپنے دلائل میں ابن الوقت دکھاتا ہے کہ کسی طرح پہلے مقامی حکمرانوں اور عوام کا مذہب اور تہذیب ایک ہی تھے اور ان درباروں تک عوام کو باسہولت رسائی حاصل تھی، لیکن انگریزی حکومت کی ''زبان''، ''وطن'' اور ''مذہب'' کا مقامی لوگوں سے اختلاف، انگریزوں کا ''روکھا مزاج'' اور ہندوستانیوں کو ''حقارت'' سے دیکھنا عوام کے غم و غصے کا سبب بنا۔ اسی رویے کی بابت ابن الوقت انگریزوں کی مقامیوں سے اس شکایت کو، کہ انھوں نے جنگ میں انگریزوں کی مدد نہیں کی، بے بنیاد قرار دیتا ہے۔ اس کی منطق میں بغاوت کا پیدا ہونا عین فطرتِ انسانی ہے، جو انگریزوں کے رویے اور ان کی اجنبیت کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ یہ نیا نظام، جس کی بنیاد ''خلق خدا کی، ملک وکٹوریہ بادشاہ زادی کا اور حکم کمپنی بہادر کا'' پر ہے، مقامی لوگوں کے لیے ایک پہیلی سے کم نہیں ہے۔ اس نظام نے پرانے امرا، مصاحبین اور متوسلین کو یکلخت بے سہارا کر دیا ہے، اس لیے مقامی لوگوں کا انگریزوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہونا ابن الوقت کے نزدیک چنداں تعجب کی بات نہیں۔ وہ انگریزوں کے پُر رعونت

رویے کا محاکمہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ مقامی لوگوں کے شبہات اور نا رضامندی کو لائقِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ حکومت نے خود تو عیسائیت کے پھیلاؤ کی کوششیں نہیں کیں، (اگرچہ تعلیمی سرگرمیوں کے پیچھے چل رہی منطق ابن الوقت کی اس رائے کو ثابت نہیں کرتی) تاہم پادریوں کا گلی گلی وعظ کہتے پھرنا، مذہبی کتب مفت تقسیم کرنا اور ہر درجے کے ہندوستانیوں کو اپنے مذہب میں شامل کر لینے کی پیہم جد وجہد کرتے رہنا، ہندوستانیوں کے جذبات انگیخت کرنے کو کافی تھے۔ اس کے علاوہ انگریزوں کا مذہب کے حوالے سے برگشتگی کا رویہ بھی عام لوگوں کو ان سے بدگمان کرنے کا ذریعہ بنا۔ اس پر ستم یہ کہ انگریز نہ مسلمانوں کی عبادت گاہوں کا احترام کرتے ہیں اور نہ ہندوؤں کے معبدوں کی تکریم کی پرواہ کرتے ہیں۔ ان کے اس پُرتکبر اور تحقیر آمیز رویے کی وجہ سے ہندوستانی انگریزوں کے خلاف ہو گئے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ابن الوقت اپنی تقریر میں نوبل صاحب کے اس دعوے کو، کہ ہندوستان کی وجہ سے انگلستان میں کچھ دولت نہیں پھٹ پڑی، چیلنج کرتا ہے۔ اس کے نزدیک اگر انگریزی حکومت سے ہندوستان کو فائدہ پہنچا ہے تو انگلستان بھی اس کے سبب مالا مال ہو گیا ہے۔ ہندوستان سے تجارت کا انگلستان کو بہت زیادہ فائدہ ہوا ہے۔ اس لیے ''اگر اغراض کا موازنہ کریں تو میرے نزدیک انگلستان کی اغراض کا پلہ جھکتا رہے گا۔'' وہ اس ساری بحث کو سمیٹتے ہوئے کہتا ہے:

> ''ہندوستانیوں کو حقیر سمجھنا اور ان کی خوشی ناخوشی کی مطلق پروانہ کرنا، یہ رنگ نہ صرف عہدہ داران انگریزی کی مدارات بلکہ خود گورنمنٹ کے تمام کاموں میں جھلکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ گورنمنٹ کی نیت بہ خیر ہے اور رعایا کو ہر طرح سے آسودہ اور خوش حال رکھنا چاہتی ہے مگر وہ دیکھتی ہے اپنے عہدہ داروں کی آنکھوں سے اور سنتی ہے، انھی عہدہ داروں کے کانوں سے جن کو رعایا کے ساتھ ارتباط و اختلاط نہیں۔''

انگریزی حکومت کی اس خرابی کا یہ نتیجہ ہے: ''ہندوستانیوں کی قسمت میں جو ڈسپاٹک گورنمنٹ سدا سے تھی، اب بھی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے اپنی گورنمنٹ تھی اب اس پر اجنبی مسلط ہے۔''(۱۲)

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ تحریر جو راج کی نئی نئی قائم ہونے والی حکومت کو درپیش مسائل اور مشکلات کے لیے تجاویز فراہم کرنے کی غرض سے کی گئی ہے وہ انگریزوں کی رعونت، مالی فوائد کی نشان دہی اور مقامی نقطہ نظر کو بھی سامنے لے کر آتی ہے۔

ثقافت کے مظہر رسوم کی مذمت اور ان کی اصلاح کے دوران ناولوں کا بیانیہ، ناول نگاروں سے پنجہ آزمائی کرتا نظر آتا ہے۔اس رستاخیز کا مشاہدہ رسوم کی مذمت میں لکھے گئے ناولوں میں بخوبی ہو جاتا ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ جن ناولوں میں رسوم کی مذمت مقصود ہے، وہاں ان کی تفصیل میں تو صفحے کے صفحے بیان ہوئے ہیں، جب کہ جو ''سلیقہ شعاری'' ان ناول نگاروں کا مقصد ہے، اس کی جھلک کم ہی دیکھنے کو ملتی ہے۔اس کی متعدد وجوہات ہوسکتی ہیں۔ایک تو نثر کا توضیحی مزاج ہے جس میں تجرد سے زیادہ تجسیم کا رجحان حاوی ہے۔دوسرا ناول بغیر زمین سے جڑے رہ ہی نہیں سکتا۔اس کی تعمیر میں چونکہ انسانی زندگی سے قربت اور اس کا باریک بین ہمدردانہ مطالعہ موجود ہوتا ہے اور یہ انسانی کرداروں کے ذہنوں اور جسموں میں چل رہی کشمکش، ثقافت اور فرد کے رشتوں کو تخلیقی سطح پر برت رہا ہوتا ہے، اس لیے اس سے اصلاحی لیکچروں کے مجموعے کا مطالبہ بے جا بھی ہے اور اس کی فطرت سے متصادم بھی۔

''اصلاح النسا'' میں بیانیے کی کش مکش اپنے عروج پر ہے۔مصنفہ جن رسوم کی مذمت کرنا چاہتی ہے انہیں تفصیل سے بیان کرتی ہے۔اس تفصیل کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کی ثقافت کتنی بھرپور تھی۔نم کو کوارا بنانے کے لیے اور خوشی کا لطف دوبالا کرنے کے لیے اس ثقافت نے تخلیقی سطح پر جو جوکرشمے دکھائے تھے، ان کے نقوش ''اصلاح النسا'' کے صفحوں پر جا بجا موجود ہیں، جن کا مطالعہ دکھاتا ہے کہ اس ثقافت کی رونق اور گہما گہمی میں، انسانی سرشت میں موجود خلقی پہلوؤں اور جمالیاتی احساس کی تسکین اور تنظیم کا کیا خوب صورت انتظام موجود تھا۔

''بسم اللہ کی ماں'' جو رسوم کی دلدادہ ہے اس کے گھر میں ہو رہی شادی کی تفصیلات میں مصنفہ کو پچاس صفحے تحریر کرنے پڑے، تب جا کر وہ بھرپور شادی کی رسوم کا کسی حد تک احاطہ کرسکی ہیں۔ دوسری طرف ''امتیاز الدین'' کا گھرانہ جو شرعی شادی کا خواہش مند ہے، جب ان کے گھر شادی کے

واقعات کا ذکر ہوتا ہے، تو بیان ایک جملے میں نپٹ جاتا ہے۔ ''جب کھانے کا وقت ہوا سلیقے کے ساتھ سب کو کھانا کھلا دیا۔'' اس سلیقے کو بیان کرنے کا موقع نہیں آیا، بس ایک لفظ کے اندر وہ انتظام و انصرام سما گیا ہے۔ یہ اختصار اپنی جگہ اس سلیقے کے پھیکے پن کو نمایاں کر رہا ہے۔ (۱۳)

ناول میں رسوم کا بیان دراصل وہ کیفیت پیدا کرتا ہے جسے باختن نے کثیر آوازی (Poly phony) کا نام دیا ہے۔ اگر چہ مصنفہ کا مقصد، ان رسوم کی قباحت بیان کرنا ہے تاہم ان کا تفصیلی اور جزئیات سے بھرپور بیان، جہاں ان کے کھکھیڑ کا اظہار ہے، وہیں قاری کے دل میں ان رسوم کے حوالے سے ایک دل کشی کے کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ حالانکہ مصنفہ کے بقول یہ رسمیں شرعاً اور افادتاً غلط ہیں، پھر بھی ان کی رعنائی اور دل کشی کم نہیں ہوتی۔ مصنفہ نے انھیں بہ تفصیل بیان کر کے اپنے ناول نگار ہونے کی دلیل فراہم کر دی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اردو داں طبقے کی بھرپور ثقافت اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ اگر یہ ناول نہ لکھا جاتا تو نہ معلوم کتنے ہی مرقعے آج نظروں سے اوجھل ہوتے اور ایک نسائی نظر سے ان رسوم کا باریک بین مطالعہ اور تجزیہ اردو ناول میں اس رنگ سے نظر نہ آتا اور شاید یہ سمجھا جاتا کہ اردو داں طبقہ ''شرعی'' شادی کا تخیل ہی رکھتا تھا اور ''عرفی'' شادی سے گریز پا تھا۔

سرشار کے ناول کرداروں کے ہجوم کے باعث خاص طور پر لائقِ توجہ ہیں۔ ان کے ناولوں میں مختلف طبقوں اور پیشوں سے متعلق کرداروں کی ریل پیل اور ان کی حقیقی کردار نگاری کے لیے سرشار کا مختلف اسالیب، لغات اور عادات کو بیان کرنا، ان کے ذرخیز ذہن کی دلیل ہے۔ ان کے ناولوں میں بعض غیر اہم کردار، خصوصاً ایسے کردار جو نوابی عہد کے لکھنو کی خوشحالی اور فارغ البالی سے مستفید ہو چکے ہیں، اودھ کے انضمام کے بعد انگریزی حکومت کے قیام پر تنقید کرتے نظر آتے ہیں۔ ''سیرِ کہسار'' میں چند ضعیف خواتین جمع ہیں اور پرانے لکھنو کو یاد کرتے ہوئے متاسف ہیں۔ یہاں محض ناسٹیلجیا کی کیفیت نہیں، بلکہ حال کی بگڑتی صورتحال پر کڑا تبصرہ بھی ہے۔ مثلاً ''دوا'' اس موقع پر مہنگی (مہنگائی) کا ذکر کرتی ہے: ''اب وہ برکت کہاں جو پہلے تھی۔ اب تو دن پر دن مہنگی ہوتی جاتی ہے۔ پانی کھاری ہوتا جاتا ہے۔'' اسی طرح وہ انگریزوں کی آمد کے بعد بیماریوں کے پھوٹ پڑنے میں اضافے کو بیان

کرتے ہوئے کہتی ہے: ''اب آئے دن ہیضہ، کال، بہیا، سوکھا، اناج مہنگا، گھی روپے کا سوا سیر، ترکاری کو آگ لگی ہوئی۔'' اس نئے نظام میں لوگ ''پرورش'' تک کو ترس گئے ہیں۔ آگے چل کر دوا پولیس کے نئے انتظامات پر عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے کہتی ہے: ''اب چوریاں کتنی ہونے لگی ہیں اور تسپر محلے محلے تھانے اور چوکیاں ہیں۔ تب ایک مرزا مسیتا بیگ اور شہر بھر کا انتظام ہوتا جاتا تھا۔'' اسی طرح ''ضعیفہ'' بھی کہتی ہے ''آگے کبھی سنتے تھے کہ چیچک کی بیماری میں سیکڑوں بچے مر گئے۔''(۱۴)

نئے نظام میں قانون اور محکمہ پولیس کی پیچیدگیاں اپنے اندر مقامیوں کے لیے بھول بھلیوں کی حیثیت رکھتی تھیں۔ تفتیش اور عدالتی کارروائی دونوں چکرا دینے والے عمل تھے۔ اس گتھی کی سلجھن مقامی افراد کے لیے ایک بڑا مسئلہ تھا۔ اردو ناولوں کے بعض کردار اس پیچیدہ نظام پر سوال اُٹھاتے اور تنقید کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً سرشار کے ناول ''سیر کہسار'' میں ہی جس سے اوپر اقتباسات درج کیے گئے ہیں، اس نئے نظام پر ''رحمانی'' نامی ایک غیر اہم کردار سوال اُٹھاتی ہے، جس کا لب لباب یہ ہے کہ نیا نظام چونکہ کسی جرم کے وقوع ہو جانے کے بعد گواہ کا مطالبہ کرتا ہے اس لیے یہ نظام دیسی آدمی کے حسبِ حال نہیں ہے۔ اگر کسی کے گھر چوری ہو جائے تو اس سے کہا جاتا ہے کہ کوئی گواہ لاؤ۔ اس پر رحمانی کا تبصرہ سنتے چلیے:

> ''اب تو پوچھتے ہیں کہ کوئی گواہ ہے۔ چوری کرتے کس نے دیکھا، گواہ لاؤ۔ اب بتاؤ گواہ کہاں سے لائیں۔ چور چوری کرنے آئے گا کہ محلے والوں کی گواہی بدنے۔ اب جس بے چارے کے یہاں چور پکڑا جائے، وہ گواہ کہاں سے لائے کہ انہوں نے چوری کرتے دیکھا تھا۔ اور چوری کی چوری ہو اور مہینوں کی دوڑ دھوپ الگ۔ آج نخاس جا کے گدڑی بازار دیکھو، کل تھانے پر جاؤ، پرسوں چوکی پر جاؤ، بندھے بندھے پھرو۔''(۱۵)

عدالتی نظام کی بھول بھلیاں دیسی آدمی کو کس طرح چکرا دیتی ہیں، اس کا بھرپور بیان منشی سجاد حسین کے ناول ''حاجی بغلول'' میں دیکھا جا سکتا ہے۔(۱۶) اسی طرح منشی سجاد کے ہی ایک اور

ناول ''طرح دار لونڈی'' میں جب انسر الدولہ کے گھر چوری ہوتی ہے اور پولیس گھر پر تفتیش کے لیے آتی ہے تو گھر والوں سے سامان کی فہرست کا مطالبہ کرتی ہے۔ انسر الدولہ کی بیگم ایسے سوالات پر آگ بگولہ ہوجاتی ہے کہ جس کے گھر چوری ہو وہ کیسے یاد رکھتا پھرے کہ کہاں سامان تھا، کتنا تھا جو چوری ہوا۔ اس کا کہنا ہے ''یہ عجب ظلم کی بات ہے۔ چیزیں اپنی کھوؤ اور یاد رکھو۔'' بیگم صاحبہ سے جب حوالدار پوچھتا ہے کہ انھیں کسی پر شک ہے تو وہ برافروختہ ہوکر بولیں ''لو کو یہ کیسا تھانے دار ہے۔ ارے ہمیں سے اُلٹا پوچھتا ہے۔ کہو ہم کو معلوم ہوتا تو تم تک بات کیوں لے جاتے، ہم آپ کیا کم تھے۔''(۱۷)

ناول انگریزی نظام کی جتنی خوبیاں بھی بیان کریں، ان میں کہیں نہ کہیں اس نظام پر تنقید یا بالواسطہ اس کی کسی خامی کا تذکرہ نکل آتا ہے۔ اس ذیل میں پولیس کا محکمہ خصوصاً انتقاد کی کسوٹی پر کسا جاتا ہے۔ پولیس کی تربیت کے ضمن میں وینا تلوار اولڈنبرگ نے بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کی صورت حال میں انگریزوں کے لیے آئندہ کسی بغاوت کا امکان پیدا ہونے سے روکنے کے علاوہ امن و امان قائم رکھنا بھی اہم مسئلہ تھا۔ اس لیے اولڈنبرگ کا تجزیہ ہے کہ استعماری دور میں پولیس کی تربیت جرائم کی روک تھام کی بجائے استعماری حکم کے نفاذ کی بنیادوں پر کی گئی ہے۔(۱۸)

یہ تحکمانہ نفاذ تبھی ممکن تھا جب پولیس کے اختیارات وسیع ہوتے۔ اردو ناولوں میں ان ''وسیع اختیارات'' کی جھلک متعدد مقامات پر جلوہ دکھاتی ہے۔ مثلاً ''کامنی'' میں جب رنبیر سنگھ کی موت کی خبر آجاتی ہے اور کامنی ایک الگ تھلگ مکان میں رہنے لگتی ہے تو وہاں ایک پولیس انسپکٹر اس کے پاس آدھمکتا ہے اور شادی کی پیشکش کرتا ہے۔ کامنی انکار کردیتی ہے، جس پر وہ اپنے اختیارات کی بڑھ چڑھ کر تعریفیں کرنے لگتا ہے۔ وہ اسے طرح طرح سے دق کرتا ہے، آوازیں کستا ہے، شعر پڑھتا ہے اور دھمکیوں پر اُتر آتا ہے۔ اس کا کہنا ہے ''میں پھاٹک توڑ کے تحقیقات کرنے آسکتا ہوں۔ پولیس انسپکٹر بڑی چیز ہے۔''(۱۹) اسی طرح منشی سجاد کے ناول ''طرح دار لونڈی'' میں بھی پولیس کی غیر قانونی سرگرمیوں کو دکھایا گیا ہے۔ ناول دکھاتا ہے کہ پولیس والے ڈرادھمکا کر لوگوں سے روپیہ لے رہے ہیں۔ کوئی اپنا رعب ڈال کر، کوئی تھانے کچہری کا خوف دلا کر روپیہ اینٹھ رہا ہے۔ نہ تفتیش ہوتی ہے نہ

مجرم پکڑے جاتے ہیں۔تحقیقات کا عمل اتنا پیچیدہ بنادیا گیا ہے کہ لوگ چوری کی درخواست تک دینے سے ڈرتے ہیں۔ افسر الدھلہ اپنے گھر ہونے والی چوری کی درخوست ان قباحتوں کے پیشِ نظر واپس لے لیتا ہے۔اس کے علاوہ سرشار کے ناول ''جامِ سرشار'' میں بھی پولیس کی کارستانیاں اور بدعنوانیاں بڑے واضح انداز میں بیان ہوئی ہیں۔جب یہودنوں کا بھائی سلیمان، جوہری کے بیٹے کی دی ہوئی کڑوں کی جوڑی کا مول معلوم کرنے جوہری کی دکان پر آتا ہے تو وہ لوگ پہچان کر پولیس میں اطلاع کر دیتے ہیں کہ یہ کڑے لالہ ایشری داس کے ہیں۔پولیس سلیمان کو تھانے لے جاتی ہے۔جب یہودنوں کو خبر ملتی ہے تو وہ نواب امین الدین اور ٹھاکر سنگھ کے پاس مدد کے لیے پہنچتی ہیں۔دونوں حضرات یہودنوں کو لے کر تھانے جا دھمکتے ہیں، جہاں نواب صاحب اپنی سماجی حیثیت کو حوالہ بنا کر تھانیدار سے معاملہ رفع دفع کرنے کو کہتے ہیں۔لیکن وہ پیسے لینے پر بضد ہے:

''تھانے دار: گھوڑا گھاس سے یارانہ کرے تو بھوکوں مرے۔ایسی مروت سے بندہ درگزرا۔مگر ابھی تک سویرا ہے کہ روزنامچے میں ہم نے کچھ لکھا نہیں ہے۔ منیب کو بلا کر سمجھا دیجیے کہ لالہ پکوڑی مل کو سمجھا کر ایک توڑا [ایک ہزار روپیہ] فوراً لے آئیں ورنہ وہ ہیں اور کوتوالی ہے۔''

آخر نواب صاحب کی مروت سے معاملہ چھ سو میں طے پا جاتا ہے، تاہم پولیس والے ''یہودنوں سے بھی سو روپے لے'' مرتے ہیں۔یوں پولیس والے مقدمے کے تمام فریقوں سے کچھ نہ کچھ نکلوا لیتے ہیں۔(۲۰)

ڈپٹی نذیر احمد کے ناول ''رویائے صادقہ'' میں ایک غیر اہم کردار انگریزوں کی معاشی پالیسی پر تنقید کرتا ہے۔اس کا نقطہ نظر یہ ہے کہ حکومت رعایا سے قرض لے کر اس سے مختلف کاموں میں لگا کر بہت زیادہ منافع کمارہی ہے جب کہ رعایا کو جو منافع اس رقم پر دیتی ہے وہ اس کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر ہے۔مثلاً رعایا کو سو روپے پر چار ملتے ہیں جبکہ حکومت خود ''بیس بیس پچیس پچیس روپے سیکڑہ'' کمارہی ہے جو صریحاً ناانصافی ہے۔اور پھر اس منافع میں سے بھی ٹیکس کی کٹوتی الگ ہوتی ہے۔اس

قرضے کی لکھت پڑھت موجود ہوتی تھی جسے پرامیسری نوٹ کہا جاتا تھا، مقامی لوگ اس اسکیم سے پوری طرح مطمئن نظر نہیں آتے۔ دوسری طرف زمینداری کی صورتحال پر بھی مقامی آبادی ناخوش ہے:

''کمبخت زمینداروں کی بھی شامت ہے۔ دیکھتے نہیں آئے دن تھانے اور تحصیل
میں کھنچے کھنچے پھرتے ہیں اور اب زمینداری میں رہ ہی کیا گیا ہے گودا گودا تو سرکار
نکال لیتی ہے باقی بچی ہڈیاں ان کو زمیندار اور کاشت کار پڑے چچوڑا کریں۔''(۲۱)

سرشار کا ''فسانہ آزاد'' جو نئی روشنی کو نہ صرف خوش آمدید کہنے والا ہے بلکہ اس کے پھیلانے میں بھی پیش پیش ہے، اس کے بیانیے میں ایک آدھ موقع پر نئے آلات کے آنے سے قدیم پیشوں کو لگنے والے دھچکے کا تاسف نظر آتا ہے۔ آزاد جب چند دقیانوسی حضرات کا پیچھا کرتے ''سک جملدی پور'' جانے کے لیے یکہ کرائے پر لیتا ہے اور کوچوان سے روزگار کی بابت سوال کرتا ہے تو یکہ والا یوں گویا ہوتا ہے: ''میاں رجگار [روزگار] تو تمھاری سلامتی سے تب ہو جب یہ ریل اڑ جائے۔ اس نے سب رُجگار لے ڈالے۔'' ''فسانہ آزاد'' جو ریل کی برکتوں کو گنواتے نہیں تھکتا، گویا اس میں بھی مقامی پیشوں کو نئے ذرائع اور مشینوں کے آنے سے ہونے والے نقصانات کا تذکرہ مل جاتا ہے۔(۲۲)

ناول میں مزاحمتی رویے کی ایک مثال مزاح کا استعمال بھی ہے۔ مزاح کے پردے میں بعض اوقات تنقید کی چبھن کو کم کر کے پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی مظہر، تصور، یا فرد کا خاکہ اڑا کر بھی اس کی استنادی حیثیت کو چیلنج کیا جا سکتا ہے۔ اردو ناول کی ذیل میں دیکھیں تو یہاں مزاح کے ذریعے جدید تصورات، نظام اور انگریزوں کا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ اس ذیل میں سجاد حسین کا ''حاجی بغلول'' بڑی نمایاں مثال ہے۔ اس میں مغربی علوم یا اصطلاحات کو بگاڑ کر لکھا گیا ہے۔ ''واقفانِ فرنیالوجی یعنی کھوپریالوجی جس سے انسان کے کاسۂ سر کا حال معلوم ہوتا ہے'' جیسے جملے اور انگریزوں کی سرپرستی میں چل رہی نیچرل غزل کی بھی تحریف کے ذریعے خوب خبر لی گئی ہے۔ اسی طرح نئے ذرائع آمدورفت اور نئے سماجی مظاہر کے آنے سے دیسی بندے کی جو درگت بنی ہے، اسے مزاح کے پردے میں بیان کرنا ''حاجی بغلول'' کا موضوع ہے۔ اخبار نکالنے یا پڑھنے کا معاملہ ہو یا ریل میں سفر کا، ناول اپنے

مخصوص مزاحیہ انداز میں دکھاتا ہے کہ ہر معاملہ رحمت کی بجائے زحمت بن گیا ہے۔ اس طرح مزاح کے پردے میں نئی صورتحال کی خرابیاں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔(۲۳)

مزاح کی ذیل میں سرشار بھی 'سیر کہسار'' میں منشی مہراج بلی اور بعض دیگر کرداروں کی مدد سے استعماری رویوں پر چوٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً مہراج بلی جب کبھی نشے میں بدمست ہوتا ہے یا کسی بات پر غصے میں آتا ہے تو وہ استعمارکاروں کی نقل کرنے لگتا ہے اور ان کے انگریزی لہجے میں اردو بولنے لگتا ہے: ''یوسور لوگ ہم کو چھیڑنے مانگتا ہے۔ یوشالا لوگ کا ہے واسطے ہم کو ڈِک (دق) کرنے مانگتا ہے۔ یو بلڈی فول کا ہے واسطے ہم چھیڑنے مانگتا ہے تم لوگ۔''(۲۴)

مہاراج بلی ناول کا سب سے مزاحیہ کردار ہے۔ اپنے کول پنے اور حمق میں مشہور ہے۔ عجب ہونق آدمی ہے۔ غلط فارسی بولنے اور مضحک صورتحال پیدا کرنے میں پیش پیش ہے۔ بھول پن بھی عجب ہے اس کا کہ باید وشاید۔ سرشار نے اس احمق کردار کی زبانی اکثر انگریزی لہجے میں اردو بلوائی ہے، جو طنز جلی کی مثال ہے۔ مہراج بلی کے علاوہ نواب چھٹن بھی نشے میں دھت ہوتے ہیں تو اسی طرح انگریزی لہجے میں اردو بولتے ہیں: ''او کالا مین مت بکو، بس، نکال دو، آدمی یوسور کو نکال دو۔'' یہ غلط اردو دو سطح پر کام کرتی ہے۔ استعمارکاروں کی نقل تو ہے ہی، ان کی نقل کے ذریعے ان کے تحکمانہ رویے پر چوٹ بھی ہے۔

اردو ناولوں میں اگر طنز کے فنی استعمالات پر نظر رکھی جائے تو یہ بھی مزاحمتی رویوں میں شامل ہوں گے۔ طنز کے ذریعے کھلے بندوں کسی فرد، رویے یا نقطہ نظر کے عیوب کو نمایاں کیا جا سکتا ہے۔ ڈپٹی صاحب کے ناول ''رویائے صادقہ'' میں سرسیّد کے نقشِ قدم پر چلنے والے طالب علموں کی روش پر بھرپور طنز کیا گیا ہے۔ مثلاً علی گڑھ کالج کے ایک طالب علم کا بیان ڈپٹی صاحب نے ناول میں یوں نقل کیا ہے: ''میں اپنے تئیں دیکھتا ہوں کہ بالکل بدل گیا ہوں۔ اور نیٹو [دیسی] سوسائٹی سے مجھے سخت نفرت ہے۔ اور مجھ کو ان کی کوئی ادا نہیں بھاتی۔''(۲۵) نذیر احمد ''سرسیّد احمد خانی وضع'' پر طنز کرتے ہوئے دکھاتے ہیں کہ کس طرح انگریزی علم اور تہذیب کو مرعوبیت کے ذریعے قبول کرنے والا کردار اپنے آباو

اجداد کی تہذیب کو ''نیٹو سوسائٹی'' کہہ کر نفرت کا اظہار کر رہا ہے۔

شرر کا ناول ''دلچسپ'' انگریزی رعونت کو طنزاً دکھاتا ہے۔ فرخ (ناول کا ہیرو) جب ایک انگریز سے مخاطب ہوتا ہے تو وہ اس کی بات نہیں سنتا اور کہتا ہے کہ تم ''ان سولائزڈ'' ہو، تمھارا لباس مقامی ہے اس لیے میں تمھاری بات نہیں سنوں گا۔ اسی طرح آگے چل کر جب لباس کے مہذب یا غیر مہذب ہونے سے بحث ہوتی ہے تو فرخ اس شخص کو قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اگر انگریزی لباس پہنا جائے تو یہ اس وضع کی ترقی ہوگی اور مقامی وضع کا تنزل، اس لیے اگر اپنی وضع میں بہتری لانی مقصود ہے تو انگریزی لباس پہننے کی بجائے مقامی لباس کو فروغ دیا جائے اور اس میں مناسب تبدیلیاں کر کے اسے بہتر بنایا جائے۔ (۲۶)

منشی سجاد حسین کا ''طرح دار لونڈی'' نئے رویوں میں سے افادہ پسند رویے پر طنز کی مثال پیش کرتا ہے۔ مقامی آدمی کے لیے مروت، ہمدردی اور خلوص کا انخلا تکلیف کا سبب ہے۔ افسر الدولہ ایسے لوگوں پر طنز کرتا ہے جو انسانیت کے ناتے نہیں بلکہ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر دوسروں سے میل جول رکھتے ہیں۔

> ''افسر الدولہ: یہ زمانہ عجب بے مروّتی کا زمانہ ہے۔ بے محنتانہ آج کل پاؤں کی چیونٹی تک کام نہیں کرتی۔ بھلا یہ لوگ [بیرسٹر] تو انگریز ہیں۔ ان کی سب باتیں ایسی ہوتی ہیں جن میں کوئی نہ کوئی اپنا فائدہ ضرور ہوتا ہے۔'' (۲۷)

مزاحمت کی ذیل میں ناولوں کا نمائندگی کا رجحان بھی اہم ہے۔ اس ضمن میں یہ دیکھنا چاہیے کہ اپنی مرعوبیت اور اصلاح پسندی کے باوجود سوائے اکا دکا ناولوں کے (مثلاً ابن الوقت) کسی اردو ناول میں انگریز بطور کردار سامنے نہیں آتے۔ مرکزی یا اہم کردار کی حیثیت تو درکنار، بیشتر ناول ان کے ذکر سے بھی خالی ہیں۔ اپنی جگہ پر یہ حکمتِ عملی نفسیاتی پہلو رکھتی ہے۔ ناول نگار ایک ایسی دنیا کی نقش گری میں مصروف ہیں، جس میں انگریزوں کا سایہ بھی نہ ہو۔ گھر کا زنانہ ہو مردوں کی دنیا، بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی انگریز کردار باقاعدہ ناول کے بیانیے کا حصہ بنے۔ باقاعدہ سے یہ مراد ہے کہ کوئی انگریز اپنے نام یا دیگر کرداری خصوصیات کے بیان کے ساتھ موجود ہو۔ انگریزوں کا یہ غیاب بھی ایک

طرح سے مزاحمتی رویہ ہے کہ مرعوبیت کے باوجود وہ ناول نگاروں یا ان کے کرداروں کے درمیان نظر نہیں آتے۔ اس کی دیگر وجوہ بھی ہوسکتی ہیں۔ مثلاً انگریزوں کا عوام سے احتراز کرتے ہوئے الگ چھاؤنیوں اور سول لائنز میں رہنا، اس کے علاوہ ناول نگاروں کو انگریزوں سے میل جول کا ذاتی تجربہ اس حد تک نہ ہوا تھا کہ وہ ان کے ناولوں کا باقاعدہ حصہ بن پاتے۔ ''فسانہ آزاد'' کی چار ضخیم جلدوں میں صرف ایک قابلِ ذکر انگریز پیلٹس نظر آتا ہے۔ ''سیرِ کہسار'' میں بھی ایک آدھ انگریز (فریزر) نظر آتا ہے۔ ابنِ الوقت میں نوبل کا کردار نسبتاً ناول نگار کی توجہ کا مرکز بنتا ہے لیکن ڈپٹی صاحب کے دیگر ناولوں میں بے نام انگریز کبھی کبھار جن کا ذکر غائبانہ کسی کردار کی زبانی ہوتا ہے اپنی جھلک دکھاتے ہیں۔

مجموعی لحاظ سے دیکھا جائے تو اردو ناول نگار مزاحمت کے ضمن میں خاصے تذبذب کا شکار نظر آتے ہیں۔ کھلم کھلا بغاوت یا انگریزی نظام پر تنقید اردو ناولوں کا کم ہی حصہ بنتی ہے البتہ مزاحمت کی بالواسطہ حکمتِ عملیاں جیسے غیر اہم کرداروں یا بعض اوقات منفی کرداروں کا نقطہ نظر اپنے اندر مزاحمت کے پہلو لے کر آتا ہے۔ ناول نگاروں کا ٹھیٹھ بامحاورہ زبان لکھنا اور انگریزی کے کم سے کم الفاظ کا استعمال ان کے اپنی زبان سے لگاؤ اور تخلیقی برتاؤ کی نشانی ہے۔ اپنے اندر مرعوبیت اور اصلاح کے عناصر رکھنے کے باوجود اردو ناول، انگریزی تصورات کا چربہ نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆

حواشی وحوالے

(۱) شرر کے تاریخی ناولوں کے محرکات کے مباحث کے لیے ملاحظہ ہو: ممتاز منگلوری (۱۹۷۸ء) *شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی جائزہ*، لاہور: مکتبہ خیابان ادب، ص ص ۴۴۔۴۰

(۲) نیر مسعود (۱۹۹۸ء) ''لکھنو کا عروج وزوال'' مشمولہ *آج* شمارہ ۶۲، کراچی: آج کی کتابیں، ص ۳۰۷۔۲۸۰

(۳) دہلی کالج سے ماسٹر رام چندر نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔ تفصیل ملاحظہ ہو:
عرفان حبیب، دھرو رائنا (۱۹۸۹ء) "The Introduction of Scientific Rationality into India: A Study of Master Ram Chandara: Urdu Journlist, Mathematician and Educatioist" مشمولہ *Annals of Science*، جلد ۴۶، شمارہ ۶، ص ص ۶۱۰۔۵۹۷

(۴) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ریورنڈ سٹورو کی کتاب (۱۸۵۹ء) *India and Christian Missions*، لندن: جان سنو، ۳۵، پیٹر نوسٹر۔ ص ص ۶۷۔۵۷

(۵) عبدالحلیم شرر۔[۱۸۹۹ء](۱۹۸۶ء) *فلورا فلورنڈا*، لاہور: مکتبہ القریش

(۶) [۱۹۰۰ء] (س۔ن۔) *ایام عرب*، بمبئی: سلطان حسین تاجر کتب، ص ص ۷۵۔۷۳

(۷) [۱۸۸۹ء] (۱۹۶۴ء) *ملک العزیز ورجنا*، مرتبہ: ممتاز منگلوری، لاہور: مجلس ترقی ادب، ص ص ۸۵، ۱۷۳، ۱۷۸، ۹۷۔۱۹۴

(۸) ایضاً ص ص ۱۹۸۔۱۷۶ اور ۸۴۔۲۸۲ عیسائیوں کی جرات و استقلال کی مثالیں پیش کرتے ہیں۔

(۹) رام بابو سکسینہ (۱۹۹۶ء) *A History of Urdu Literature*، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ص ۳۷۵۔ ان کے علاوہ خالد اشرف نے شرر کے ناولوں کی فضا کو غیر حقیقی قرار دیتے ہوئے انھیں داستان سے ملا دیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: ڈاکٹر خالد اشرف (۲۰۰۳ء) *برصغیر میں اردو ناول*، دہلی: کتابی دنیا، ص ۱۰

(۱۰) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ان کا مضمون ''شرر'' مشمولہ *میزان*، کراچی: اردو اکیڈمی سندھ (بار دوم ۱۹۶۵ء) ص ص ۳۵۔۲۲۳

(۱۱) منشی احمد حسین خان، [۱۸۹۸ء؟] (۱۹۰۰ء) *جواں مروی*، لاہور: خادم التعلیم پنجاب، ص ص ۳، ۲۹، ۴۴۔۴۱، ۵۵، ۶۳، ۶۶

(۱۲) ڈپٹی نذیر احمد، [۱۸۸۸ء] (۱۹۹۵ء) *ابن الوقت* لاہور: انجمن ترقی اردو، ص ص ۳۲۔۱۱۷۔ ابن الوقت کی تمام تقریر اس تذبذب کا اظہار ہے جسے ہومی بھابھا (Homi Bhabha) نے تخالف آمیزی (Ambivalence) کہا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو اس کی کتاب۔ (۱۹۹۴ء) *The Location of Culture*، لندن: راؤٹلیج، ص ص ۹۴۔۸۵

(۱۳) رشیدالنساء، (۲۰۰۰ء) *اصلاح النساء*، کراچی: روشن خیال احمد برادرز، ص ص ۵۰۔۱۱۱

(۱۴) رتن ناتھ سرشار [۱۸۹۰ء] (۲۰۰۲ء) *سیر کہسار*، جلد دوم، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ص ۱۲۔ کرداروں کی ریل پیل اور واقعات کے حجم غفیر کے حوالے سے ڈاکٹر خالد اشرف مختلف نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سرشار کا ''لاابالی پن'' انھیں کرداروں کی ''نفسیاتی پیچیدگیوں'' کے مشاہدے سے باز رکھتا ہے۔ اور ان کے ناول ''عصری حسیت اور نفسیاتی شعور کے فقدان'' کا شکار ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ تجزیہ ایک حد تک

ہی درست ہے کہ سرشار کرداروں کے معاملے میں اتنے سطحی نہیں ہیں۔ ان کے ناولوں میں کرداروں کی ذہنی کیفیت کا بیان بھی ملتا ہے اور اس کیفیت کے کرداروں پر اثرات بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً ''جامِ سرشار'' کے نواب امین الدین بیانیے کے ساتھ ساتھ جھجک سے بے باکی اور آخر ش المیاتی کیفیات سے گزرتے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کے کردار میں نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے۔ خالد اشرف صاحب کا سرشار کے حوالے سے نقطۂ نظر جاننے کے لیے دیکھیے: ڈاکٹر خالد اشرف (۲۰۰۳ء) ص ۱۰

(۱۵) سیرِ کہسار، جلد دوم، ص ۱۴

(۱۶) منشی سجاد حسین، (۱۹۲۶ء) سرگزشت حاجی بغلول، لکھنؤ: ادبی پریس، بار دوم

(۱۷) (۱۹۶۵ء) طرحدار لونڈی، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ص ص ۸۱۔۸۰

(۱۸) وینا تلوار اولڈنبرگ (۱۹۸۴ء) The Making of Colonial Lucknow: 1856-1877، نیو جرسی: پرنسٹن یونیورسٹی پریس، ص ۶۵، اس کا اپنا بیان یہ ہے:

"The rulers determined, that more emphasis be placed on maintaining order than on the prevention and detection of crime."

(۱۹) رتن ناتھ سرشار [۱۸۹۴ء؟] (۱۹۵۸ء؟) کامنی، لکھنؤ: نسیم بک ڈپو، ص ۴۹۲۔

(۲۰) منشی سجاد حسین (۱۹۶۵ء) ص ص ۹۰۔۸۸۔ اس کے علاوہ دیکھیے رتن ناتھ سرشار [۱۸۸۷ء] (۱۹۶۱ء) جامِ سرشار، کراچی: مکتبۂ اسلوب، ص ص ۱۸۱۔۱۷۳، اقتباسات صفحہ نمبر ۱۷۸ اور ۱۷۹ سے لیے گئے ہیں۔

(۲۱) ڈپٹی نذیر احمد [۱۸۹۴ء] (۱۹۳۶ء) رویائے صادقہ، دہلی: با اہتمام منذر احمد، ص ۳۶۔

(۲۲) رتن ناتھ سرشار [۱۸۸۰ء] (۱۹۸۴ء) فسانۂ آزاد، جلد اوّل، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ص ۱۱۴۔

(۲۳) منشی سجاد حسین (۱۹۲۶ء) ص ص ۲۲، ۵۰

(۲۴) رتن ناتھ سرشار [۱۸۹۰ء] (۲۰۰۲ء) سیرِ کہسار، جلد اوّل، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ص ۳۱۶

(۲۵) ڈپٹی نذیر احمد (۱۹۳۶ء) ص ۴۴

(۲۶) عبدالحلیم شرر [۲۔۱۸۸۵ء] (۱۹۳۰ء) دلچسپ، لاہور: گیلانی الیکٹرک پریس بک ڈپو، ص ص ۶۷۔۶۵

(۲۷) منشی سجاد حسین (۱۹۶۵ء) ص ۲۴۰

❀ ❀ ❀